

جناب سفیر اختر صاحب

وسطی ایشیا اور برصغیر پاک و ہند تاریخی تہذیبی ثقافتی، دینی اور علمی رشتوں پر ایک نظر (۲)

چنگیز خان اور امیر تیمور گورگان اور ان کے قریبی اخلاف کا جو تعلق برصغیر کی سیاست سے تھا، یہ موضوعین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس پر مستزاد ان دونوں ”حملہ آوروں“ سے منغل بادشاہت کے بانی ہمایوں کے محمد بابر (م ۱۵۳۰ء) کا بھی تعلق تھا۔ وہ بابر کی جانب سے امیر تیمور گورگان کی اولاد میں سے تھا اور ماں کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب چنگیز خان سے ملتا تھا۔ بابر کے حوالے سے بھی موضوعین نے چنگیز خان اور تیمور کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا ہے۔

چنگیز خان کے حوالے سے عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی کی تاریخ ”تجزیۃ الامصار و تزیینۃ الاحصاء“ معروف بہ تاریخ و صف کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ ۶۹۹ھ اور ۷۱۲ھ کے درمیان لکھی گئی تھی اور نظم و نثر کے صنائع لفظی و معنوی کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ فارسی انشاء پر داری کے ایک نمونے کی حیثیت سے اس کے منتخب حصے پنجاب یونیورسٹی کے نصاب ”منشی فاضل“ میں شامل رہے ہیں۔ اس کی جلد اول رتنا احتتام عہد ارغون خان (شیخ محمد اقبال استاد اور نیشنل کالج لاہور نے غیر ضروری عبارتوں اور اشعار حذف کرتے ہوئے مرتب کی تھی۔ نصابی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی شرحیں، ترجمے اور فرہنگ تیار کیے گئے ہیں جن میں سید اولاد حسین شاداں بگرامی کی ”دفر چنگ“ تاریخ و صف کو طلبہ کے حلقوں میں پذیرائی حاصل رہی ہے۔

چنگیز خان پر مستقل بالذات کتابوں کے علاوہ امریکی مصنف ہیرلڈ ایم کی تالیفات ”چنگیز خان“ اور BARCH OF THE BARBARIANS کے تراجم کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اردو کے بلند پایہ مترجمین نے انہیں اردو کا جامہ بنایا ہے۔ مولوی محمد عنایت اللہ، پروفیسر عزیز احمد اور ریگیڈر گلزار احمد نے ”چنگیز خان“ کے الگ الگ تراجم کیے ہیں۔

امیر تیمور گورگان کے حوالے سے سب سے پہلے ”ترک تیموری“ یا ”ملفوظات صاحبقرانی“ کا ذکر آنا چاہیے جسے امیر تیمور کی خود نوشت کی حیثیت سے بعض اہل قلم نے بہت اہمیت دی ہے، اگرچہ امیر تیمور کی جانب اس کا انتساب مشکوک ہے۔ ”ملفوظات تیموری“ کے اردو میں ایک سے زیادہ ترجمے ہوئے اور لوگوں نے امیر تیمور کے بارے میں اس کتاب سے اپنی رائے قائم کی۔

امیر تیمور کی سوانح حیات اور عہد پرچہ متعدد کتابیں لکھی گئی، ان میں نظام الدین شامی، شرف الدین یزدی اور عبداللہ ہاتفی کے مد نظر ناموں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نظام الدین شامی نے خود امیر تیمور کی فرمائش پر ۱۴۰۴ء اور ۱۴۰۴ء کے درمیان تیمور کے عین حیات ”ظفر نامہ“ مکمل کیا۔ ایک دوسرے مؤرخ حافظ ابرو نے ۱۴۲۵ء میں مد نظر نامہ شامی کا ذیل مرتب کیا اور پھر شاہ رخ مرزا ۱۴۴۷ء کے حکم سے تاج سلاتی نے مد ذیل ظفر نامہ کے نام سے شامی کی تالیف میں ۱۴۰۴ء سے ۱۴۱۰ء تک کے حالات شامل کیے۔

تیموری حکمران ابراہیم سلطان نے سرکاری کاغذات اور عینی شاہدوں کے بیانات، نیز پہلے سے لکھی گئی کتابوں کی مدد سے امیر تیمور کے حالات اور فتوحات پر تاریخ مرتب کی جسے شرف الدین علی یزدی نے اپنے خاص ادبی سلیقے سے از سر نو لکھا اور ”فتح نامہ تیموری“ کا نام دیا، تاہم نظام الدین شامی کے ”ظفر نامہ“ کو اتنی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ شرف الدین یزدی کی کتاب بھی ”فتح نامہ تیموری“ کے بجائے ”ظفر نامہ“ کے نام سے ہی مقبول ہوئی۔

ظفر نامہ تیموری (یزدی) پر انحصار کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمان جامی کے بھانجے عبداللہ ہاتفی نے ۱۵۲۱ء) تیمور کی فتوحات اور سیاسی کارناموں کو نظم کیا ہے جو ”تیمور نامہ ہاتفی“، یا ”ظفر نامہ ہاتفی“ کے نام سے معروف ہے۔

ان ”ظفر ناموں“ میں سب سے زیادہ مقبولیت ”ظفر نامہ یزدی“ کو حاصل ہوئی ہے۔ بعد کے مؤرخین نے جن میں ”روضۃ الصفا“ اور ”حبيب السیر“ کے مصنف بالخصوص قابل ذکر ہیں، تیمور کے عہد پر لکھتے ہوئے اس پر انحصار کیا ہے بلکہ اکثر اس کی عبارتیں حذف و اختصار یا تبدیلی الفاظ کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ ”ظفر نامہ“ نے تاریخ نگاری کا جو نمونہ پیش کیا، بعد کے آنے والوں نے ایران اور برصغیر پاکستان و ہند میں اس کے تتبع کی کوشش کی۔

ظفر نامہ یزدی اپنے موضوع کے لحاظ سے امیر تیمور اور اُس کے جانشینوں کی تاریخ ہے مگر حقیقتاً یہ اس دور کی ایسی عمرانیاتی دائرۃ المعارف ہے کہ اُس دور کے ہر طبقے کی زندگی اور معاشرت پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ ہو گئی ہے ظفر نامہ وسطی ایشیا (افغانستان، ماوراء النہر، ایران، گرجستان، ارمنستان، قفقاز) برصغیر پاکستان و ہند اور ایشیائے کوچک کی سیاسی اور حکومتی تشکیلات کے بارے میں بنیادی اور اہم اطلاعات فراہم کرتا ہے۔

برصغیر کے مغل حکمرانوں کو ”ظفر نامہ“ سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ بابر کے خوش طبع دوست راور ایک روایت کے مطابق سیکڑی (زین الدین خوانی ۱۵۳۴ء) نے بابر کے حملہ ہند (۱۵۲۶ء) کے ذکر میں لکھا ہے کہ اُس موقع پر بابر کے سپاہیوں میں سے بعض نے ”ظفر نامہ“ کا مطالعہ کیا تاکہ برصغیر کے جغرافیائی حالات سے آگاہ ہوں۔ اس موقع

پرفخانی نے ظفرنامہ کے حوالے سے برصغیر کے حالات، بیان کیے ہیں اور اپنے دور کے مشاہدات کے ساتھ ان کا تقابل کیا ہے۔ جہانگیر نے عبدالستار بن قاسم لاہوری سے ”ظفرنامہ“ کی تلخیص تیار کرائی تھی۔ اسی طرح شاہجہان نے بھی ”ظفرنامہ“ سے دلچسپی لیتے ہوئے اس کا ایک خلاصہ مرتب کرایا۔

برطانوی دور میں ”ظفرنامہ“ کو مولوی الادوانے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی BIBLIOTHECA INDICA سیریز کے تحت مرتب کیا جو سوسائٹی کی جانب سے دو جلدوں میں ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ ”ظفرنامہ“ کی اشاعت سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہوا۔ ظفرنامہ کے کلکتہ ایڈیشن میں کوئی اشاریہ شامل نہیں تھا۔ مولوی محمد شفیع رپرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے اپنی ضرورت کے تحت اس کی پہلی جلد میں مذکور اشخاص اور مآکن کا اشاریہ تیار کیا اور دونوں جلدوں کے مضامین کی ایک فہرست اشاریہ مرتب کی۔ وہ ”ظفرنامہ“ پر مزید کام کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار ان کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ ان کی رحلت کے بعد یہ یادداشتیں پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی نے مرتب کر دی تھیں۔

تیجوری عہد کی دوسری مبسوط تاریخ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی (م ۸۲۴ھ) کی ”مطلع السعیدین و نفع البعیدین“ ہے جو دو دفاتر (حصوں) میں منقسم ہے۔ دفتر اول میں ”ازرائش سلطان ابوسعید المغانی۔ تا ذکر وفات صاحبقران تیمور ہے۔ دفتر دوم“ فرمانروائی شاہ رخ تاپایان فرمانروائی ابوالغازی سلطان حسین و سال ۵۸۷ھ۔“ پر حاوی ہے۔ مولوی محمد شفیع نے ”مطلع السعیدین“ کے دفتر دوم کا ابتدائی حصہ ۱۹۴۱ء میں اور آخری حصہ ۱۹۴۹ء میں مرتب کیا۔ (کل صفحات ۱۵۵۸) ”مطلع السعیدین“ کے منتخب حصے منشی فاضل کے نصاب میں شامل کیے گئے اور طلبہ کی ضروریات کے لیے ان کے ترجمے اور فہرنگ مرتب ہوتے رہے۔

مولوی محمد شفیع کی ”مطالعہ تیمور“ کی روایت کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے آگے بڑھایا اور تیموری سلاطین کے عہد کی فارسی شاعری پر دو قیع مقالات لکھے۔

”ظفرنامہ“ یزدی، ”کی کلکتہ، تہران اور تاشکند کی اشاعتوں کے بعد مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبہ عربی و فارسی مولانا ابوالشام محمد یوسف نے عبداللہ ہاتفی کا ”ظفرنامہ“ مرتب کیا جو یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

امیر تیمور کے حوالے سے بنیادی مافذوں کی اشاعت کے ساتھ امیر تیمور معتد مورخین کی توجہ کا مرکز رہا ہے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (م ۱۹۳۸ء) نے تین جلدوں میں ”تاریخ اسلام“ لکھی تو ”وسطی ایشیا“ کے حکمرانوں کے لیے کچھ صفحات مختص کیے۔ انہوں نے امیر تیمور اور سلطان بایزید لیدرم کی معرکہ آرائی پر ایک کتابچہ مدجگ انگوہ“ لکھا جو ۱۹۳۱ء میں الگ سے شائع ہوا تھا۔

ماضی قریب میں حقیقت و افسانہ کے امتزاج پر مبنی ہیر لڈیم کی تالیف TAMERLANE کو بہت پڑھا گیا ہے۔ اس کا اولین ترجمہ مولوی محمد عنایت اللہ نے ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ بعد میں پروفیسر عزیز احمد نے ایک نیا ترجمہ کیا اور ۱۹۵۶ء میں بریگیڈیئر گلزار احمد کے قلم سے اس کا تیسرا ترجمہ شائع ہوا۔ امیر تیمور کے حوالے سے برصغیر کے فنِ تعمیر اور مصوری پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ان کے برادر عبدالرحمن چغتائی نے اردو اور انگریزی میں چند مقالات لکھے ہیں۔

جسم و جان کے ”فاتحین“ کے حوالے سے جہاں چنگیز خان، امیر تیمور اور ان کی اولاد مطالعہ و تحقیق کا موضوع رہی ہے، وہیں ٹکرو ذہن کے فاتحین میں صوفیاء و علماء اور اہل شعروادب کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ گزشتہ صفحات میں وسطی ایشیاء سے آنے والے صوفیاء اور علماء کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ سلسلہ خواجگان یا سلسلہ نقشبندیہ کی اشاعت میں خواجہ باقی باللہ نے بطور صوفی حصہ لیا مگر ان سے پہلے سخل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر اس سلسلے کی تعلیمات سے اعتناء کر چکا تھا۔ بابر نے خواجہ عبداللہ احرار کے رسالہ ”والدیہ“ (فارسی) کو ترکی میں نظم کیا تھا۔ خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد میں سے متحدہ افراد برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوئے۔ ان کے ایک پوتے خواجہ عبدالحق (بن خواجہ محمد عبداللہ) بابر کی ملازمت میں تھے۔ دونوں کے درمیان مراسلت رہتی تھی۔ مرزا کامران (فرزند بابر) خواجہ عبدالحق کا مرید تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ امیر ابو العلاء نقشبندی (م ۱۶۵۱ء) تھے جو سلسلہ ابو العلاء نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ برصغیر پاکستان و ہند کے تیموری حکمرانوں میں نقشبندی سلسلے کی مقبولیت کا شاید ایک سبب یہ دہ تیموری“ روایت بھی ہے۔

خواجہ باقی باللہ کے مرید و خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی تھے۔ ان سے نہ صرف نقشبندی سلسلے کو برصغیر میں فروغ حاصل ہوا بلکہ مجددی بزرگوں کی مساعی نے افغانستان میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ کابل کے ملا شور بازار خانان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ افغانستان کے شمال مشرق کے علاقے کے نہری نظام کے بارے میں انیسویں صدی کے آغاز میں سید عزت اللہ نے ”تاریخ منازل بشار“ میں نقل کیا تھا کہ یہاں کی ایک نہر کا محصول آبیانہ شاہ افغانستان کی طرف سے مرہند کی خانقاہ و مزار کے لیے وقف تھا۔

نقشبندی صوفیاء۔۔۔ خواجہ عبداللہ حق بغدادی، خواجہ عزیزان رامیتنی، خواجہ عبد اللہ احرار، خواجہ محمد پارسا اور شیخ یعقوب چرخي وغیرہ کی تالیفات برصغیر کے ہر اچھے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ برصغیر کے نقشبندی اہل طریقت نے نقشبندی سلسلے کے طریقہ کی اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ وسطی ایشیاء کے نقشبندی بزرگوں کی تعلیمات عام کی گئی ہیں۔ نقشبندی متون کی ترتیب و تدوین اور ترجمہ و تلخیص کی روایت مسلسل چلی آرہی ہے۔ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (حیدر آباد سندھ)، ملک محمد اقبال اور محمد نذیر رانجھانے وسطی ایشیاء کے ان

نقشبندی بزرگوں کی کئی تالیفات جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع کی ہیں۔ سید امیر کلال (م۔ ۱۱۳۰ھ) خواجہ بہاء الدین نقشبند کے مرشد گرامی تھے۔ اُن کے احوال میں ایک رسالہ ”آگاہی سید امیر کلال“ کے نام سے منظر ہے۔ پہلی بار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع ہوا۔ [کراچی، مکتبہ اعلیٰ (۱۹۶۱ء)] اسی طرح انہوں نے سات رسائل کا ایک مجموعہ ”رسائل مشاہیر نقشبندیہ“ (حیدر آباد، سندھ)؛ حاجی محبوب الہی (۱۹۵۸ء) [مرتب کیا جس میں خواجہ بلریزان رامیتنی کا رسالہ شریفہ، خواجہ محمد پارسا کا رسالہ قدسیہ، مولانا یعقوب چرخنی کا رسالہ انسیہ اور خواجہ عبداللہ کا رسالہ انفاس نفیسہ شامل ہیں۔

رسالہ قدسیہ کی ایک اشاعت ملک محمد اقبال (راولپنڈی) کی کاوش سے منصفہ شہر پر آئی۔ [راولپنڈی : مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۵ء)] اس اشاعت کا متن محبوب المطالع۔ دہلی کی اشاعت (۱۳۰۸ھ) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اشاعت (۱۹۵۸ء) اور چار خطی نسخوں کے تقابلی مطالعے سے متعین کیا گیا ہے۔ محمد نذیر رانجھا نے مولانا یعقوب چرخنی کے رسائل۔ ابدالیہ، انسیہ، شرح اسماء الحسنیٰ اور حورانیہ [یا جمالیہ]۔ کے فارسی متن مرتب کیے ہیں اور اولیٰ الذکر دو رسائل کو اردو کا جامہ پہنا یا ہے۔

فارسی متون

ابدالیہ، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۷۸ء)
 انسیہ، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)
 دو اثر غیر چاپی یعقوب چرخنی ”شرح اسماء الحسنیٰ“ اور ”حورانیہ“ (مجلہ دانش اسلام آباد)
 شمارہ ۱ (۲۰۰۵ء)، ص ۱۲-۲۷
 اردو تراجم۔

ابدالیہ، لاہور: اسلامک بک فاونڈیشن (۱۹۷۸ء)
 انسیہ (مع متن)، اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۳ء)
 محمد نذیر رانجھا کی تقدیم و تعلیقات کے ساتھ شیخ محمد عالم صدیقی علوی کا تذکرہ ”لمحات فی نفحات القدس“ [اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان (۱۹۸۶ء)] بھی شائع ہوا ہے۔ یہ تذکرہ مد شرح احوال و کرامات و اشتغالات و رد وابط بزرگان عارفان سلسلہ ذکیہ جہریہ سمرقند و بخارا“ سے متعلق ہے۔ مؤلف نے جس سلسلہ تصوف کو ”جہریہ“ کا نام دیا ہے۔ یہ سلسلہ مخواجگان ہی کی ایک شاخ ہے جس کا نمایاں شاعر ذکر جہرقا اور یہ خواجہ محمد یوسف ہمدانی مرشد خواجہ احمد یسوی کی جانب منسوب ہے۔ اس کے برعکس خواجہ عبدالخالق غمدوانی ذکر خفی پر عامل تھے۔

وسطی ایشیا کے نقشبندی صوفیاء کے تراجم کے حوالے سے محمد زبیر رانجھا کے ساتھ یہ زادہ اقبال احمد فاروقی کا ذکر ضروری ہے۔ انہوں نے خواجہ محمد یار سا کے رسالہ قدسیہ، مولانا یعقوب چرخنی کے رسالہ انبیہ، خواجہ عزیز ان راضیتی کے رسالہ شریفیہ اور خواجہ عبید اللہ احرار کے رسالہ انفاس نفیس کے تراجم ”رسائل نقشبندیہ“ [لاہور: مکتبہ نبویہ (س۔ن)] کے نام سے کیے ہیں۔ مولانا یعقوب چرخنی کے رسالہ انبیہ کا ترجمہ محمد زبیر رانجھا نے بھی کیا ہے دونوں تراجم کے تقابلی مطالعے اور فارسی متن سے مطابقت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد زبیر رانجھا متن کے زیادہ قریب رہے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند میں وسطی ایشیا کی سیاست سے دلچسپی کا ایک دور وہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے اس خطے کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی اور جب ۱۸۵۷ء کے بعد اسے شمال مغربی ہند کا اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت جو رویے اختیار کیے، اس کا جائزہ گذشتہ صفحات میں لیا جا چکا ہے۔

۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب نے جہاں دنیا بھر کے اہل فکر کو ”اشتراکیت“ کے بارے میں واضح نقطہ نظر اختیار کرتے پر آمادہ کیا، وہیں برصغیر پاکستان و ہند کے اہل فکر نے بھی اشتراکیت کی حمایت مخالفت یا دو امتدادوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔

برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی خلیفہ اربعہ کے فلسفہ اشتراکیت کو مسترد کیا اور وسطی ایشیا پر اشتراکی تسلط کو مسلمانوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ استعماری روس کے بالمقابل امام شامل جیسے اہل عزم و وصلہ کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے اشتراکیت کے خلاف مزاحمتی تحریک کے حق میں آواز بلند کی۔ ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رکن مولوی عبدالولی صدیقی نے ”دقائق تسلط روسیابراسیا“ (فارسی) کے نام سے ایک کتاب لکھی اور وسطی ایشیا پر روسی تسلط کو تاریخی تناظر میں دیکھا۔ یہ کتاب مؤلف نے ذاتی طور پر سکوپہ ضلع جسر بنگال سے شائع کی تھی۔

علمائے کرام کا وہ گروہ جو برصغیر کی تحریک آزادی میں ”انقلابی“ طریقے پر یقین رکھتا تھا اور پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اس نے جرمنی اور افغانستان کے تعاون سے آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ اشتراکی انقلاب کے بعد اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ ان علمائے کرام کے نقطہ نظر کو تقویت اشتراکی رہنماؤں کے اس رویے سے ملی کہ انہوں نے خفیہ معاہدوں سے پردہ اٹھا دیا جو اتحادی طاقتوں نے ترکی کے مستقبل کے بارے میں باہم کر رکھے تھے۔ ان علمائے کرام اور کچھ پرجوش و جواؤں نے اشتراکیت کو اسلام کی معاشی تعلیمات کے قریب دیکھا اور اشتراکیت کے الحادی فلسفے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اسلام کے مترادف قرار دیا۔ میسر حسین قدوائی، مولانا عبداللہ ندوی

اور مولوی برکت اللہ بھوپالی کی تحریریں اس زاویہ نظر کی عکاس ہیں۔

کیونٹ پارٹی آف انڈیا اور اس کی FRONT ORGANIZATIONS نے سویت یونین کے معاشی و سیاسی نظام پر بڑی مقدار میں ٹیپ تیار کیا مگر یہ اشتراکی فلسفہ اور اشتراکی آمریت کی کامیابیوں کی مدح سرائی کے لیے وقف رہا۔ اس میں نہ تو وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ان کے قوم پرستانہ جذبات کی عکاسی کی گئی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد نیم سرکاری اداروں، آزاد تنظیموں اور دینی۔ سیاسی جماعتوں نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کے بالمقابل اسلام کے معاشی و سیاسی نظام کے خدوخال پیش کرنے شروع کیے۔ مظہر الدین مدنی سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم اور جماعت اسلامی پاکستان کے قلم کاروں کی تحریریں اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ تحریک آزادی کے دوران میں اشتراکی ذہن رکھنے والے دانش وروں اور کیونٹ پارٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی کبھی حمایت نہ کی تھی البتہ انہیں انڈین نیشنل کانگریس کی ”اشتراکیت“ سے دلچسپی رہی، تاہم تحریک آزادی کے آخری مرحلے میں، جب تقسیم ہند نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی، اشتراکی دانش ور ادھیکاری نے برصغیر کی ”مسلم قومیت“ کو تسلیم کرنے ہوئے اشتراکی قومیت فلسفے میں اسے جگہ دی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اشتراکی ذہن نے قیام پاکستان کی بنیاد یعنی دینی شناخت کو تسلیم نہ کیا اور وہ مزدوروں کو ”سرخ سویرے“ کے نام پر منظم کرنے میں کوشاں رہے۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں، کچھ پاکستان کی جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور کچھ روس کے اپنے تعصبات کے تحت، سویت یونین نے بین الاقوامی سطح پر آزاد ہندوستان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور یوں پاکستان میں اشتراکی تنظیموں کے لیے سرکاری یا عوامی سطح پر کوئی نرم گوشہ پیدا نہ ہو سکا۔ جن سیاسی جماعتوں نے اپنے منشوروں میں ”اشتراکیت“ یا ”مآئسی اشتراکیت“ کو برائے وزن بیت شامل کیا تھا، حقیقتاً وہ بھی مارکسٹ نہیں بلکہ سوشلسٹ ڈیموکریٹ جماعتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کو جو کچھ بُری پہلی پذیرائی حاصل ہوئی، اس میں اشتراکی فلسفے سے زیادہ ان کے قوم پرستانہ لغزوں کی کار فرمائی تھی۔

عوامی جمہوریہ چین کی آزادی اور پھر روس۔ چین کشمکش کے دور میں جب پاکستان کے تعلقات اپنے ہمسایہ ملک چین سے بہت بہتر ہو گئے اور پاکستان نے اپنے دوست کو ”اقوام متحدہ“ کی سلامتی کونسل میں لانے اور امریکہ کے ساتھ اس کے روابط استوار کرانے میں کردار ادا کیا تو پاکستان کے اشتراکیوں کو اشتراکیت کے حق میں چین۔ پاکستان دوستی کی آرٹیں پروپیگنڈے کا موقع ملا، تاہم جماعت اسلامی پاکستان اور بعض دوسرے اہل دانش نے اس صورت حال میں یہ بات واضح کی کہ ہمسایہ طاقت سے دوستی اپنی جگہ جس طرح عوامی جمہوریہ چین اپنی آئیڈیالوجی کے خلاف کسی کو بشمول پاکستان، مخالفت کی اجازت نہیں دیتا، اسی طرح پاکستان بھی اپنی اساس یعنی اسلام

کے بالمقابل کسی دوسری آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی پاکستان کے ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ (لاہور) کے ادارہ بابت جون ۱۹۶۸ء نے عوامی سطح پر متوازن نقطہ نظر کو عام کیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کو ایک دستور ساز [اور قانون ساز] اسمبلی کے لیے تھے مگر ان انتخابات میں ملک کے معاشی مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ مجیب الرحمن کی ”عوامی لیگ“ نے مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کو اپنی انتخابی مہم کا مرکزی مسئلہ بنایا، اسی طرح صدر پاکستان محمد یوسف خان کی پروردہ ”بے لگام سرمایہ داری“ کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں جو ناہمواری پیدا ہو چکی تھی، اس نے ملک کے غریب طبقے کے لیے ”اسلامی اشتراکیت“ میں جاذبیت پیدا کی، گو یہ جاذبیت نظریاتی سطح پر نہیں تھی بلکہ نئی سیاسی جماعت ”پاکستان پیپلز پارٹی“ نے اسلام کے اقتصادی نظام کو سوشلزم کے قائم مقام قرار دیا تھا۔

۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دوسروں میں جہاں اشتراکی فلسفہ حیات، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں، اسلامی نظام حیات کے ساتھ اس کے تقابل پر عوامی طرح وچر وجود میں آیا، وہیں عملی سطح پر ”وسطی ایشیا“ کے مسلمانوں پر اشتراکیت کے جوئے تلے جو کچھ بیت رہی تھی، اس پر بھی کھل گیا۔ اس دور میں جن اہل قلم نے وسطی ایشیا کو اپنے مطالعہ کا مستقل موضوع بنایا، ان میں آبادشاہ پوری، محمد حامد اور ثروت صولت کے نام نمایاں ہیں۔ آبادشاہ پوری کی مختصر کتاب ”مسلمان قومیں۔ اشتراکیت کے سائے میں“ اور جامع کتاب ”روس میں مسلمان قومیں“ نے ایک خلا پُر کیا۔ ادارہ معارف اسلامی کراچی کے سیکرٹری، پروفیسر خورشید احمد نے اپنے زیرِ ادارت ماہنامہ ”دجراخ راہ“ کا سوشلزم نمبر شائع کیا جس میں اسلام اور اشتراکیت کا دو نظاموں کی حیثیت سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا اور خصوصی شمارے کا ایک حصہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کے لیے مختص تھا۔

آبادشاہ پوری اور پروفیسر خورشید احمد صاحبان کی کاوشوں کے نتیجے میں وسطی ایشیا پر تالیف و ترتیب کو ایک نئی جہت ملی اور آئندہ چند برسوں میں کچھ وقیع مقالات کے ساتھ چند کتابیں سامنے آئیں۔

وسطی ایشیا سے دلچسپی کا ایک پہلو اس خطے کے سفرناموں کی اشاعت ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے آرمینیس ویبیری کی خود نوشت (جس کا بڑا حصہ وسطی ایشیا کی سیاحت پر مبنی ہے) کا ترجمہ ”پروفیسر ویبیری کا سفرنامہ“ قابل ذکر ہے۔ آرمینیس ویبیری جسے عثمانی خلیفہ کے دوست ہونے کا دعویٰ تھا اور ترکوں سے اُس کی دلچسپی، نیز مبینہ قبولِ اسلام نے برصغیر کے مسلمان اہل دانش میں اُس کا عمدہ IMAGE بنادیا تھا، گو آج ہر شخص جانتا ہے کہ وہ برطانوی جاسوس کے طور پر سفر کرتا رہا تھا اور اُس کا قبولِ اسلام بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک TRICK سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

آرمینیس دیوبری کے علاوہ شوکت عثمانی کا سفرنامہ مد میری روس یا ترا اہم ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا سفرنامہ ہے جو سوویت یونین کی آئیڈیالوجی سے نہ صرف متفق ہے بلکہ اسے عام کرنے کے لیے دالمانہ جذبہ رکھتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے عشرت علی صدیقی نے اپنی یادداشتیں ”دینن گراڈ تا سمرقند“ کے نام سے مرتب کیں مگر انہوں نے کسی نظر باقی لاگ یا لگاؤ کا کوئی ثبوت نہیں دیا بلکہ ایک آزاد خیال، غیر جانبدار سیاح کے طور پر اپنی نگاہ مناظر قدرت اور لوگوں کی نشست و برخاست پر رکھی۔ قیام پاکستان کے بعد بعض صحافیوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا مگر انہیں وسطی ایشیا کی کسی ریاست میں جانے کا اتفاق نہ ہوا، ایسے سفرناموں کو نظر انداز کرنے ہوئے صرف اُن سفرناموں پر ایک نظر ڈالنا مفید ہے جن میں ”وسطی ایشیا“ اور یہاں کی مسلم آبادی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

۱۹۵۷ء میں روسی سفارت خانے کی نگ و دو اور خواہش پر جمعیت علمائے پاکستان کے ایک وفد نے مولانا عبدالحماد مادی بدایونی کی سربراہی میں سفر کیا۔ مولانا بدایونی نے سفرنامہ ”تاثرات روس“ کے نام سے مرتب کیا جو جمعیت علمائے اُستان نے شائع کیا۔ وفد نے سرکاری پروگرام کے مطابق مزارات، مساجد، کتب خانے اور سرکاری مذہبی ادارے دیکھے۔ ۳ جون ۱۹۵۷ء کو وفد تا شقند پہنچا۔ مولانا بدایونی کے الفاظ میں۔

حضرت مولانا قاضی حنیف الدین صاحب ادارہ دینیہ نے سولگار و ائمہ مساجد کے ساتھ وفد کا استقبال فرمایا۔ ”تا شقند کی آبادی ایک ملین ہے۔ یہاں بیس مسجدیں ہیں جو سب کی سب آباد ہیں ادبازینت ہیں۔ (لوگ) ازبکی زبان بولتے ہیں۔ بوڑھوں میں نماز کی پابندی کا خاص طور پر شوق و جذبہ ہے، البتہ نوجوانوں میں کم ہے۔ مسلمان کافی خوشحال ہیں، راستے صاف ستھرے ہیں۔ مسلمان عورتوں میں پردہ تقریباً نہیں ہے۔

ایک اور موقع پر ”دینی زندگی“ کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

مسجدوں کا انتظام الحمد للہ قابل قدر و استحسان ہے۔ ہر قاری خطبات عربی زبان ہی میں پڑھتا ہے، البتہ جمعہ کے خطبے سے قبل پاکستان و ہندوستان کی طرح ایک گھنٹہ ازبکی زبان میں مسائل و احکام بیان کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ محکومات و احکام دینی سے باخبر علماء ہیں.... مساجد میں مسلمان پوری طرح آزاد ہیں، نماز روزے کا کافی شوق موجود ہے۔

مولانا عبدالحماد بدایونی کے وفد کے ایک رکن مولانا راغب احسن کو ان کے تاثرات سے چنداں اتفاق نہیں تھا۔ مولانا راغب احسن نے کوئی تفصیلی سفرنامہ تو نہ لکھا البتہ ایک تاثراتی مضمون میں واضح کیا کہ ”پاکستانی علماء کے وفد کا دورہ آزاد نہیں بلکہ سرکاری نگرانی میں بالکل مقید دورہ تھا۔ دراصل وہ ہمیں کم چیزوں کو دکھانا اور کھیلوں، تماشوں اور ضیافتوں میں زیادہ مصروف رکھنا چاہتے تھے۔“

”ناشقد کی دینی زندگی کے بارے میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے تاثرات اوپر درج کیے جا چکے ہیں مولانا رغب احسن نے کیا محسوس کیا؟ اُن کے الفاظ میں۔

”ناشقد ترکی سے زیادہ روسی شہر بنا دیا گیا ہے۔ وقت کا بیشتر حصہ دس گیارہ پرانی مسجدوں اور قبرستانوں کے دکھانے میں صرف کر دیا گیا حالانکہ ان مسجدوں میں صرف چند سفید ریش نہایت بوڑھے نمازی تھے۔ نوجوان نہ ہونے کے برابر تھے اور لڑکے تو بالکل نہ تھے۔

مولانا رغب احسن نے روسیوں کی سادگی، مہمان نوازی اور چڑچوش گرم دلی کی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”روسی عوام قابل محبت قوم ہے۔ ان میں مغربی یورپ کی قوموں جیسا احساس برتری نہیں ہے۔ بعض حضرات کو ”وسطی ایشیا“ کے اکا دکا شہر دیکھنے کا موقع ملا مگر انہوں نے مستقل سفر نامے لکھنے کے بجائے اپنی خود نوشت تحریروں میں اپنے تاثرات شامل کیے ہیں۔ سید ذوالفقار علی بخاری کو ”یاکو“ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ایک بات میں نے ایسی دیکھی کہ روسیوں کے جذبہ حب الوطنی کی داد دینا پڑی۔ اس کتب خانے میں دینا بھر کی ہر وہ کتاب موجود ہے جس میں کسی نہ کسی طرح آذربائیجان کا ذکر آیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کتاب کے مصنف کی تصویر بھی موجود ہے۔ ایک دولہ اٹھا کہ لاہور، پشاور، ملتان، ٹھٹھہ اور ڈھاکے کا تذکرہ دینا بھر کی کتابوں میں موجود ہے، ہم بھی اگر وہ کتابیں اکٹھی کریں جن میں ان شہروں کا تذکرہ ہے تو شاید ہمارے نوجوانوں کو بھی اس امر کا احساس ہو کہ ہم بھی کچھ تھے اور ہم بھی کچھ بن سکتے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند سے ”وسطی ایشیا“ جانے والوں کے ذکر کے ساتھ وسطی ایشیا سے آنے والے سیاحوں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ اگرچہ ان سیاحوں کی سفری یادداشتیں یا سفر نامے اردو میں منتقل نہیں ہوئے اور اُن کے تاثرات سے اردو خوان طبقہ ابھی تک ناواقف ہے۔ انیسویں صدی کے سیاحوں میں سے ایک حاجی زین العابدین مستعلی شاہ شروانی تھے۔ حاجی زین العابدین نے ترکی، ایران، عراق، مصر، اور فلج فارس کی ریاستوں کے ساتھ برصغیر کی سیاحت کی تھی اور اپنی یادداشتیں ”ریاض السیاحت“ اور ”بستان السیاحت“ کے نام سے قلمبند کی ہیں۔ ”بستان السیاحت“ (تالیف ۱۲۴۴ھ/۱۸۳۱ء) ایران سے شائع ہو چکی ہے جس میں سیاح مؤلف نے اپنے دیکھے ہوئے شہروں کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا ہے اور اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ ڈھاکہ سے متعلق حصہ کا ترجمہ سرمایہ بصائر (کراچی) میں شائع ہوا ہے۔